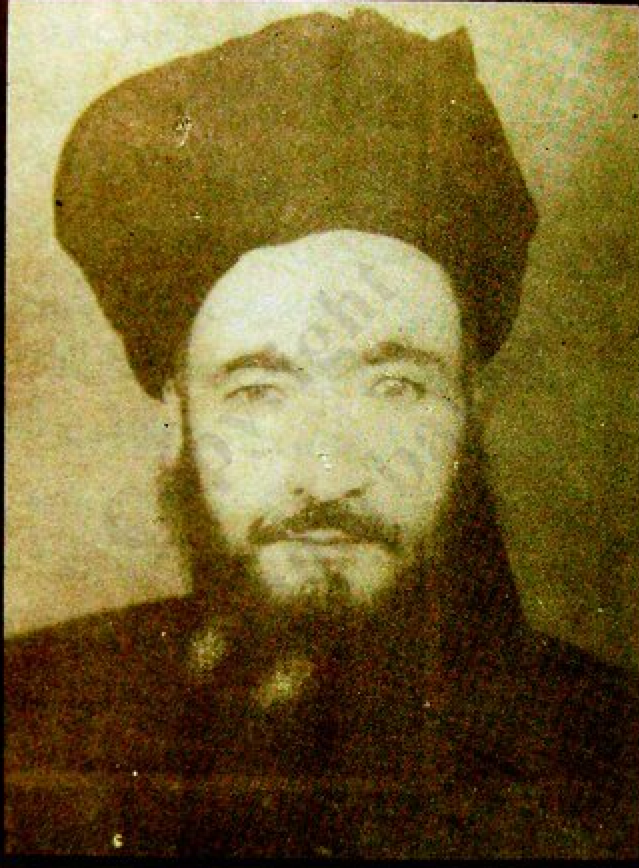
احیائے تصوف کا علمبردار

نوائے صوفیہ



احیائے تصوف کا علمبردار

نوائے صوفیہ

قسط: ۴

نگران: ________ ابوالعرفان محمد بشیر فاضل عربی برہ والے

منتظمِ اعلیٰ ________ فاچو محمد امین

منتظم: ________ غلام حسین معروفی

صدر مجلس شاورت ________ بابو محمد سلیم

مدیر: ________ ڈاکٹر غازی محمد نعیم

نشر و اشاعت

انجمن محمدیہ بلتستانیہ

اسلام آباد

نام پمفلٹ : ______ نوائے صوفیہ قسط ۴

نگران : ______ ابو العرفان محمد بشیر

ٹائیٹل و کتابت : ______ ارشاد صدیقی

مطبع : ______ لھر رنگ آئین پرنٹرز

______ الفلاح عسکریہ مارکیٹ کمیٹی چوک نزد گلستان سینما راولپنڈی

ناشر : ______ انجمن محمدیہ بلتستانیہ اسلام آباد

تقطیع : ______ 23 x 33

تعداد صفحات : ______ 24 صفحات

تاریخ اشاعت : ______ مارچ ۱۹۹۲ء

قیمت 6.00 ۶/۰۰ روپے

پتہ برائے خط و کتابت :

دفتر نوائے صوفیہ

جامع مسجد صوفیہ نوربخشیہ 6-7/4

اسلام آباد

فہرست مضامین

تفکّر و تذکّر

تحریر: علّامہ محمد بشیرؔ

ہر چیز کو عدم سے معرضِ وجود میں لانے والے خالقِ حقیقی نے اپنی تقدیر ازلی کے مطابق نظام کائنات کو ایک معین عرصے تک برقرار رکھنے کے اسباب مہیا فرمائے ہیں۔ نظامِ حیات کو صحیح خطوط پر چلانے کے لئے عالمِ انسانیت کو وجود میں لانا رب العالمین کا ایک بہترین انتخاب تھا۔ غیر عالمِ انسانیت کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ ہر ہر مختلف النوع شے کی اپنی اپنی کائنات ہے۔ اپنا اپنا عالم ہے۔ غیر عالمِ انسانیت کا دائرہ وجود جس قدر تکوینی پھیلاؤ پر محیط ہے اس کا درست اندازہ لگانا کسی کے بس کا روگ نہیں۔ اس کا علم تو صرف خالقِ حقیقی کو ہے۔ خالقِ حقیقی کا اعلان بھی ہے۔

ان اللہ یعلم وانتم لا تعلمون

تحقیق، خدا ہی جانتا ہے اور تم نہیں جان سکتے ہو

بہر حال خلّاقِ کائنات نے عالمِ انسانیت کو غیر عالمِ انسانیت پر فوقیت دی ہے۔ عالمِ انسانیت کو ایسے ایسے کمالات کا حامل ٹھہرایا گیا ہے۔ جن سے ہر وجودی شے کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کائنات کے پوشیدہ اسرار معلوم کرنے کے لئے عالمِ انسانیت کو بے پناہ صلاحیتوں سے نوازا گیا ہے۔ حقائق اشیاء کی تحقیق کا گُر عالمِ انسانیت کو بتایا گیا ہے۔ چنانچہ ارشادِ ربانی ہے۔

واللہ اخرجکم من بطون
امھاتکم لا تعلمون شیئاً و
جعل لکم السمع والابصار والا
فیٔدۃ لعلکم تشکرون ۝

اللہ نے تم کو اپنی اپنی ماؤں کے پیٹوں سے
اس حال سے باہر نکالا کہ تم کسی چیز کو نہیں جانتے
تھے اور اس نے تمہارے کان، آنکھیں اور دل
پیدا فرمائے تاکہ تم اس کی ان وجودی نعمتوں
کا شکر بجا لاؤ۔

اللہ پاک نے اس قرآنی اعلانِ نعمت میں عالمِ انسانیت کو اس امر کی طرف متوجہ کیا ہے کہ وہ جب عدم سے وجود میں آیا تو سراپا جہالت کی منہ بولتی تصویر کا مصداق تھا۔ لہٰذا اس نے جہالت کی تاریکی سے نکال کر علم کی روشنی کی سمت رواں دواں کرنے والی سمجھ بوجھ سے اس کو نوازا۔ وجودِ انسانی میں کان، آنکھ اور دل تین ایسی وجودی نعمتیں ہیں۔ جن کے درست استعمال کے نتیجے میں عالمِ انسانیت مدرکِ کلیات کے لقب کا حقدار ٹھہرا اسی وجہ سے عالمِ انسانیت کو غیر عالمِ انسانیت پر صوری اور معنوی دونوں صورتوں میں حکمرانی کا حق ملا۔ چونکہ جملہ کائنات کا حقیقی حکمران تو خود خالقِ حقیقی کی ذات ہے۔ مگر اس نے عالمِ انسانیت کو

اپنی طرف سے نیابتاً حکمرانی کا حق عطا فرمایا اور عالمِ انسانیت رب العالمین کا خلیفہ قرار پایا۔ ارشادِ الٰہی ہے۔

هو الذی جعلکم خلائف
فی الارض ۝

وہ وہ ذاتِ پاک ہے جس نے تم کو
زمین پر اپنے قائم مقام بنائے۔

گویا خالقِ حقیقی کی مرضی اور حکم کے مطابق عالمِ انسانیت کا جو جو فرد کائنات میں تصرف کرے گا۔ وہ رب کے نائب کی حیثیت سے تصرف کرنے والا ہوگا۔ اس کو اس تصرف میں خالق کائنات کے حکم کو مدِ نظر رکھنا ہوگا۔ پس جو جو فرد رب العالمین کی چاہت اور حکم کی خلاف ورزی کی صورت میں کائنات میں تصرف کرے گا وہ خیانت کار خلیفہ قرار پائے گا اور وہ اس قرآنی توبیخ کی زد میں آئے گا۔ ارشادِ خداوندی ہے۔

فمن کفر فعلیه کفره ولا
یزید الکفرین کفرهم عند
ربهم الا مقتا ۝

پس جو ناشکری کا مرتکب ہوگا۔ اس کی ناشکری اس کے لئے ضرر رساں ہوگی ناشکروں کو اپنے رب کے نزدیک ان کی ناشکری صرف ناراضگی بڑھاتی ہے۔ نیز ناشکروں کو انکی ناشکری صرف نقصان میں اضافہ کرتی ہے۔

فرمانِ الٰہی سے اس کی خوب وضاحت ہو جاتی ہے کہ کائنات میں تصرف کرنے کے لئے حکمِ رب کا لحاظ رکھنا نہایت ضروری ہے۔ اگر کسی فردِ انسان کی طرف سے اس ضروری امر میں کوتاہی سرزد ہو جائے تو وہ رب کا غضب زدہ اور لعنت زدہ فرد قرار پائے گا۔ عالمِ انسانیت نے کائنات بسانے میں جو نمایاں ظاہری ترقی کی ہے وہ بھی درحقیقت خالقِ کائنات کی طرف سے اُسے عطا کی گئی نعمتِ عقل و ادراک کی رہینِ منت ہے۔

عالمِ انسانیت میں صوری اور معنوی کمالات کے حامل افراد کا وجدان عالمِ انسانیت کی ممتاز حیثیت کا آئینہ دار ہے۔ اس بناء پر اس عالم کے اہلِ کمال کی ہر جگہ تعریف کی جاتی ہے ہر سو ان کی شہرت کا ڈنکا بجتا ہے۔ ان کی تعریف درحقیقت کمالات عطا کرنے والے خدائے لاشریک کی تعریف ہے۔ اس جگہ الحمد للہ رب العٰلمین ہر ایک کا وردِ زبان رہا کرتا ہے یعنی تمام تعریفیں جملہ عالم کو پالنے والے اللہ کے لئے ہیں۔

عالمِ انسانیت کے باکمال فرزندان قوم اس عالم کے لئے روشنی کے مینار ہیں۔ انہی کے دم سے عالمِ انسانیت قدرے دیرپا ثابت ہو سکتا ہے۔ انہی کے وجود باوجود کی بدولت کھلے بندوں والے ناشکرے جگہ جگہ دندناتے پھرتے ہیں اور عذابِ الٰہی سے محفوظ رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے

لولا الابرار لهلك الفجار

سے وارد ہوا ہے۔ اس عالمِ آب و گل میں عالمِ انسانیت کے اہلِ کمال کو کبھی کبھار افراد قوم کی طرف سے حوصلہ شکنی اور شدید ترین ناانصافی کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ یہ رجحان بھی عالمِ انسانیت کی ایک قابلِ مذمت کمزوری ہے۔ ایسے افراد

اعدلوا هو اقرب للتقوى کی صریح خلاف ورزی کے مرتکب قرار پاتے ہیں۔ چونکہ ہر ایک عالم میں اضداد کا وجدان بھی تقدیر ازل کا فیصلہ ہے۔ لہٰذا تقدیر کے فیصلے سے مفر ممکن نہیں۔

وبضدها تتبین الاشیاءُ

یعنی چیزیں اپنی مخالف صفت کی وجہ سے آشکار ہو جاتی ہیں۔" کے مطابق جانب مخالف کے ساتھ تصادم عین فطری عمل ہے۔ اس فطری عمل کے تحت نیک و بد کا امتیاز ہوتا ہے۔ روشنی اور تاریکی کا فرق نمایاں ہوتا ہے۔ آرام اور دکھ سے قدر کا درس ملتا ہے۔ چنانچہ قدر عافیت کسے داند کہ در مصیبتے گرفتار شود والی کہاوت مشہور ہیں۔

بعض اہلِ کمال کو مخصوص احوال سے گزرنا پڑا اور انہیں قدر دانی کے فقدان کا شکوہ کرنا بھی پڑا۔ چنانچہ ایک باکمال شاعر کو یوں کہنا پڑا۔

یوں پھریں اہلِ کمال آشفتہ حال افسوس ہے
اے کمال افسوس ہے تجھ کو کمال افسوس ہے

قدرِ نعمت بعد زوال

تحریر: سید بشارت علی الموسوی

گذشتہ دنوں مسلکِ نوربخشیہ کے روحانی پیشوا سید عون علی الموسوی وفات پاگئے۔ ان کی وفات کا عقیدت مندوں نے جتنا ماتم کیا احاطۂ تحریر میں آنا مشکل ہے۔ ان کی جدائی میں لاکھوں آنکھیں اشکبار تھیں اور اسلام آباد سے خپلو تک ایک قیامتِ صغریٰ کا سا سماں پیدا ہو گیا تھا۔ میرے نزدیک یہ بات ہماری قوم کے لئے لمحۂ فکریہ ہے ہم لوگ علماء اور بزرگانِ دین کی زندگی میں ان کے ارشادات سے فیض حاصل نہیں کرتے اور زندگی میں ان کی قدر نہیں کرتے مگر بعد میں بے جا قبروں کے مجاور بن جاتے ہیں۔

میرے نزدیک سب افرادِ ملت کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرنا چاہیئے اور اسلاف کی عظمت کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے اور اپنے اندر صحیح اسلامی اور انقلابی رُوح بیدار کرنی چاہیئے۔ علمائے کرام کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ فروعات کے چکر میں پڑنے اور منفی بحث اور تنقید سے گریز کریں اور اپنی توانائیاں قوم کی اصلاح اور تعلیم و تربیت کے لئے وقف کر دیں۔ نوجوان خصوصاً طلبا کا بہترین سرمایہ ہیں۔ ان کی اولین ذمہ داری حصولِ علم ہے۔ مگر ان کا علمِ دین اور مذہب سے یکسر بیگانہ نہیں ہونا چاہیئے۔ قوم میں ذہنی اور فکری انقلاب پیدا کرنے میں طلباءُ کا نہائیت اہم حصّہ ہے۔ آیئے ہم سب عہد کریں کہ سید عون علی الموسویؒ کے مشن پر چلتے ہوئے اپنے اندر روحانی انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ اور اتحاد بین المسلمین کو فروغ دیں۔

علی احمد قمرؔ

زہلر و گوتمنا

اللہ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

رسولِ مقبول

نعت

بہارِ دو جہاں کا بانکپن ہیں
محمدؐ زینتِ ہر انجمن ہیں

ابد تک روشنی پھیلی ہوئی ہے
بشر ہیں یا وُہ پروین و پرن ہیں

زمانے میں اُجالا ہو گیا ہے
نمودِ صبح کی پہلی کرن ہیں

گلوں میں رنگ و بو ہے اُنکے دم سے
متاعِ حُسن و تزئینِ چمن ہیں

مہک پھولوں میں ہے اُنکے نفس کی
گلِ نسترن و بُوئے نسترن ہیں

نزولِ رحمتِ یزداں ہے اُن سے
وہ اُمت پر سدا سایہ فگن ہیں

یہ ثابت ہو گیا معراج کی شب
صبا رفتار ہیں گل پیرہن ہیں

وہ ہاتھ اُٹھیں تو رحمت ہیں مُجسّم
وہ لب گویا ہوں تو شیریں سخن ہیں

انہی کی نذر ہیں سب نعت کے شعر
انہی کے نام ہیں جتنے سخن ہیں

شفاعت کو ہماری آئیں گے وُہ
قمرؔ ہم بھی اگرچہ خستہ تن ہیں

نشر و اشاعت کی اہمیت

تحریر: غلام حسین معروفی ۔ اسلام آباد

یوں تو کسی بھی شعبۂ زندگی کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ کوئی ایسا شعبہ وجود ہی میں نہیں آسکتا جس کی کوئی افادیت نہ ہو۔ فی زمانہ نشر و اشاعت کا شعبہ حد درجہ اہمیت اور افادیت کا حامل ہے۔ آج دنیا میں جتنی توجہ ذرائع ابلاغ پر دی جا رہی ہے شاید ہی کسی چیز پر دی جا رہی ہو۔ نشر و اشاعت ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے وقت کے تینوں رُخ یعنی ماضی، حال اور مستقبل دیکھے جا سکتے ہیں۔ کتاب شاید انسان کی سب سے بڑی ایجاد ہے۔ یہ وہ وسیلہ ہے جس کے ذریعے کسی بھی دور کی دانش اور علم کو محفوظ کیا جا سکتا ہے اور اسے اگلی نسل تک منتقل کیا جا سکتا ہے۔ اور آنے والی نسلوں کے لئے ماضی کی طرزِ معاشرت اور نظریاتِ زندگی کے بارے میں جاننے میں آسانی رہتی ہے۔ خدائے بزرگ و برتر نے اپنے برگزیدہ ترین پیغمبروں کو صاحبِ کتاب بنا کر بھیجا اور یہ بات بھی کسی سے مخفی نہیں کہ اکثر انقلاباتِ عالم کسی عظیم شخصیت یا عظیم کتاب کے پیدا کردہ ہیں۔ چاہے یہ انقلاب کسی خدا کے مقرب بندے کا لایا ہوا ہو یا ڈارون، روسو، کارل مارکس اور لینن کا۔

ماضی قریب میں ایران میں جو اسلامی انقلاب برپا ہوا، اس میں بھی نشر و اشاعت کا بڑا ہاتھ تھا اور صوفیائے کرام نے تو اپنی ساری توانائیاں ہی تصنیف و تالیف کے کام میں صرف کر دی تھیں۔

امیر کبیر سید علی ہمدانیؒ کی تصانیف کی تعداد بیسیوں ہیں۔ حضرت امام غزالیؒ نے اپنی مختصر عمر میں احیاء العلوم جیسی عظیم کتاب کے علاوہ سو سے اوپر کتابیں تصنیف کیں۔ شاہ سید محمد نور بخشؒ نے فقہ الاحوط، کتاب الاعتقادیہ، سلسلۃ الذہب الصوفیہ کے علاوہ بہت سی کتابیں لکھیں۔ مولانا رومیؒ نے ایک ضخیم مثنوی کے علاوہ ایک بڑا دیوان اشعار کا ترتیب دیا، خاص کر سعدیؒ اور حافظ کی تصانیف یعنی گلستان، مثنوی اور دیوان فارسی ادب کے چار ستونوں میں سے تین ہیں۔ البتہ چوتھا ستون یعنی شاہنامہ فردوسی کا شاعر شاید صوفیاء میں شمار نہیں ہوتا تھا۔

الغرض تصنیف و تالیف اور نشر و اشاعت دین، بزرگانِ دین کا مقصد حیات رہے ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے پچھلے کئی سالوں سے ہماری قوم علم و ہنر سے بالکل بے بہرہ رہی ہے۔ کسی نئی کتاب کا تصنیف ہونا تو درکنار وہ پرانی کتابیں بھی جو سلف کی متروک نشانیاں ہیں، ناپید ہوتی جا رہی ہیں۔ اب صرف کچھ کرم خوردہ کتابیں چند لوگوں کی الماریوں کی زینت ہیں ورنہ کوئی ایسا انتظام نہیں کہ ان کتابوں کی دوبارہ اشاعت ہو سکے۔ اس دور میں تو پڑھے لکھے لوگوں میں فارسی بولنے اور لکھنے کا رواج تھا۔ مگر اب مروجہ تعلیم اردو اور

انگریزی زبان میں دی جاتی ہے اور نئی نسل کے لئے پرانی کتابوں سے استفادہ کرنا ناممکن ہے۔ اور یہ بوسیدہ کتابیں محض کیڑوں کی غذا بننے کے علاوہ اور کوئی افادیت نہیں رکھتیں۔ یورپ کے سکالرز کے لئے تو یہ کتابیں تحقیق کا سرچشمہ ہیں اور اس افسوس ناک صورتِ حال کے ضمن میں اکثر اقبالؒ کا ایک شعر دہرایا جاتا ہے۔

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ

بات سچ ہے۔ امیر کبیر سید علی ہمدانی کی کتاب کا حوالہ دینا ہو تو برٹش میوزیم کی لائبریری سے مائیکرو فلم منگوانا پڑتی ہے۔ گذشتہ دو دہائیوں میں چند کتابوں کا ترجمہ عربی، فارسی سے اردو میں ہوا تھا۔ ان مترجمین کے اسمائے گرامی میں علامہ محمد شبیر صاحب، غلام حسن صاحب، ڈاکٹر سید اشرف ظفر اور مولانا علی محمد صاحب قابلِ ذکر ہیں۔ ۱۹۸۵ء میں "نوائے صوفیہ" کی اشاعت سے اُمید تھی کہ نشر و اشاعت کے میدانوں میں گزشتہ کمزوری کی کچھ تلافی ہو جائے گی۔ مگر بدقسمتی سے چند شماروں کے بعد یہ رسالہ پھر بند ہو گیا۔ اب اللہ کے فضل و کرم سے یہ سلسلہ دوبارہ چل پڑا ہے۔ اُمید ہے کہ اس سے نہ صرف ہماری قوم کے شعور کو جلا ملے گی۔ بلکہ نئی نسل کی تعلیم و تربیت میں بھی یہ رسالہ مددگار ثابت ہوگا۔

احیائے تصوف

دورِ حاضر میں

(تحریر: غازی محمد نعیم)

ایک سوال اکثر سوچنے والے کے ذہن میں اُبھرتا ہے کہ آیا تصوف دورِ ابتلا کی پیداوار تو نہیں اور ایسا سوچنے والوں کے نزدیک تصوف کم و بیش دُروں بینی کا نتیجہ ہوتا ہے یعنی خارجی دُنیا کے انتشار، سیاسی ابتری اور معاشی انحطاط سے گھبرا کر آدمی اپنے من کی دنیا میں جائے پناہ کا متلاشی ہو جاتا ہے اور مابعد الطبیعاتی تصورات کو اپنے لئے ذریعۂ سکون بنانا چاہتا ہے اور اس طرح تخیّل اور تصور کی دنیا میں وہ حقیقی دُنیا کی محرومیوں کا ازالہ چاہتا ہے۔ چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ جب کوئی مستحکم حکومت یا سلطنت کمزور پڑ گئی اور طوائف الملوکی کا شکار ہوئی تو اس اثنا میں تصوف، شاعری اور فنونِ لطیفہ کو فروغ حاصل ہوا۔ مگر یہ بات سو فیصدی حتمی نہیں بلکہ دیکھا یہ گیا ہے کہ جب سیاسی اور تہذیبی زندگی اپنے عروج تک جا پہنچی ہے اور افرادِ معاشرہ تہذیب یافتہ اور لطیف احساسات اور کیفیاتِ داخلی کے حامل ہو جاتے ہیں تو وہ اپنی پرسکون اور پُر آسائش زندگی کی بور کن یکسانیت سے بڑی حد تک بیزار اور سرگشتہ ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی کو زیادہ بامعنی بنانے کے جویا بن جاتے ہیں اور اس سعیٔ فضول میں وہ کئی حربے اختیار کرتے ہیں۔ جن انسانوں کی شخصیت میں توازن کا پہلو قدرے کمزور ہوتا ہے وہ

سستے ذرائع کی طرف رجوع کرتا ہے جن میں سے ایک ذریعہ ذہنی حالت کو تبدیل کرنے والی ادویات کا استعمال DRUG ADDICTION ہے لیکن تصوف کو ذہنی تعیش یا ADDICTION سے مماثل قرار دینا اس کی وسعت SCOPE کو محدود بنانے کے مترادف ہوگا. جبکہ تصوف کے حامیوں کے نزدیک یہ علم تمام علوم کا حاصل ہے اور انسان اور خدا کو ملانے والا راستہ ہے اور حقیقتِ حیات و کائنات کا جامع ترین شعور ہے. ان معنوں میں تو علمِ تصوف دیگر سب علوم و فنون پر بھاری نظر آتا ہے. کیونکہ علم کا تعلق حیات و کائنات کے وجودِ ظاہری کی نسبت وجودِ باطنی سے زیادہ ہے اور ویسے بھی باطن کی دنیا زیادہ پُراسرار اور وسیع تر ہے اس سے بھی زیادہ حیات بخش، متوازن اور ترقی پسند نظریہ علمِ تصوف کو جدید علوم و افکار اور ارتقائے انسانی کی روح سے ہم آہنگ بنانے والوں کا ہے جس کے نزدیک روحانی تسکین بنیادی مسئلہ نہیں بلکہ وہ اپنے آپ کو لامحدود اور لافانی بنا دینا چاہتے ہیں اور احساسِ فنا کے اس گہرے احساس سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں جس نے انسان کے ذہن میں حیاتِ انسانی کی وقعت کو گھٹا دیا ہے اور اسے احساسِ کمتری کا شکار بنا دیا ہے. اس احساسِ کمتری سے نجات پانے کی ایک کوشش ان اصحاب نے بھی کی جنہوں نے نیچرل سائنس اور ظاہری علموں کے بل بوتے پر فطرت کی تسخیر کی ٹھانی اور جہاں فطرت کے عوامل کو اپنی رضا کے تابع بنایا وہاں آفاتِ ارضی پر بھی بڑی حد تک قابو پایا. مگر اس کے باوجود دو مسائل موجود ہے یعنی خوفِ فنا کا مسئلہ اور وہ روحانی خلاء اور تشنگی جس کو دور کرنا ظاہری آسائشوں اور آسودگیوں سے ممکن نہیں اور ایسے میں حواس باختہ ابنِ آدم فراموشی کے دامن میں پناہ ڈھونڈھنا چاہتا ہے. کاروبارِ زندگی خاص طور پر معاشی مشاغل میں حد سے زیادہ مصروفیت شاید اسی کی ایک صورت ہے. اگر انسان خود فریبی میں مبتلا نہیں ہے تو کوئی وجہ نہیں بنتی کہ وہ سر پکڑ کر سوچنے نہ بیٹھ جائے کہ میں کون ہوں.؟ اور میری ہستی کی حقیقت کیا ہے.؟

بدقسمتی سے سرمایہ دارانہ نظام اور نیچرل سائنس کی ترقی کے ساتھ روحانی اقدار کا شیرازہ بکھر گیا. مذہب کو قدامت پسندی کی علامت سمجھا جانے لگا اور انسان نے اپنے گھمنڈ میں خدا کے اقتدارِ اعلیٰ کے حامل ہونے کے عقیدے سے باغی ہو کر خود اپنی ذات کو کائنات کا محور سمجھنا شروع کیا. نتیجتاً وہ خود کو پیش آنے والے واقعات و حادثات کا ذمہ دار بھی خود کو ٹھہرانے لگا. اس رویے کے باعث انسان کی خود اعتمادی میں کچھ اضافہ تو ہوا بعض معاملات میں اس کے مثبت نتائج بھی برآمد ہوئے جس کی مثال سائنس اور ٹیکنالوجی کی بے پناہ ترقی اور فطرت پر انسان کا بڑھتا ہوا تسلط ہے مگر وہ اپنی خلقت اور اپنی حقیقت کو بھول گیا. یوں ایک طرف تو اپنے مسائل کا ذمہ دار خود کو ٹھہرانے کے باعث اور اپنے معاملات کے ضمن میں قادرِ مطلق ہونے کے گھمنڈ کی وجہ سے وہ خدا کے ساتھ وہ ربط کھو بیٹھا جو احساسِ تنہائی و لاچارگی کے رنج فرسا لمحوں میں ذریعۂ تسکین بنا کرتا ہے. دوسرے خود غرضی کو فروغ ملا اور ہر شخص خدا اور مخلوقِ خدا سے بے نیاز ہو کر اپنی خواہشاتِ نفسانی کی تکمیل کی طرف متوجہ ہوا اور یوں انسانی ہمدردی اور بھائی چارے کا نظام کمزور پڑتا گیا جو خدا ترس انسانوں کی معاشرتی زندگی کا اہم ترین پہلو ہے دریں اثنا سرمایہ دارانہ نظام سے بغاوت کے طور پر اشتراکی فلسفے کو مقبولیت حاصل ہوئی. اشتراکی فلسفے کے پیروکار ارتقائے حیات پر یقین رکھتے ہیں. حقوقِ انسانی کے داعی ہیں. سائنسی طرز

فکر پر زور دیتے ہیں، مگر خدا کا انکار کرتے ہیں۔ اس بے خدا نظام کی بنیادی رُوح سرمایہ دارانہ نظام سے کچھ مختلف نہ تھی۔ اصل مطمعِ نظر دونوں کا سرمایہ تھا۔ البتہ اس سرمائے کی تقسیم طریقِ کار پر اختلاف تھا۔ سرمایہ دارانہ نظام روحانیت سے بہتر ابھی لیکن انسان کے حیاتیاتی تقاضوں Biological needs سے بڑی حد تک ہم آہنگ ہے۔ جس کے ظاہری حُسن کو جمہوریت کے خوشنما رنگوں نے مزید دوبالا کر دیا ہے۔ لیکن اشتراکی نظام میں تو یہ خوبی بھی نہ تھی۔ یہ نظام تو لوگوں کی شخصی آزادی اور صاحبِ جائداد ہونے کی بنیادی خواہش کی بھی نفی کرتا ہے یوں اس نظام کی بنیاد گویا محض پیٹ پر رکھی گئی تھی اور ذہن اور رُوح کو بڑی حد تک نظر انداز کیا گیا تھا چنانچہ حال ہی میں بین الاقوامی اُفق پر رونما ہونے والے واقعات نے ثابت کیا کہ یہ نظام بودا اور خلافِ فطرت ہے۔

مذہب اور تصوف کا نظام شائستگی پسندی کا نظام ہے دنیا کے ہر مذہب نے ہمیشہ اعلیٰ اخلاقی قدروں کی ترویج پر زور دیا ہے اور انسان کے اندر موجود حیواتی جذبوں کی تہذیب کرنے کی کوشش کی ہے اور تصوف تو خاص طور پر نفسِ امارہ کی مخالفت ہی کا نام ہے۔

یہاں اس امر کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے کہ تصوف کا نام سنتے ہی اکثر لوگوں کا ذہن رہبانیت اور فقرِ خانقاہی کی طرف جاتا ہے اور وہ اسے رجعت پسندی سمجھ کر ایک قلم کرد دینے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ یہ طرزِ فکر درست نہیں تصوف دراصل ایک مخصوص طرزِ فکر کا نام ہے جس میں انسان اپنی تمام تر صلاحیتوں کو ایک اعلیٰ و ارفع مقصد کے حصول کی خاطر وقف کر دیتا ہے وہ بے عمل، دروں بین اور رہبانیت پسند نہیں ہو جاتا بلکہ اپنی سرگرمیوں کو ارتقائے حیات کی بنیادی روح سے ہم آہنگ کر لیتا ہے اور ظاہر اور باطن کی دُنیا میں نئے نئے مقامات کی تسخیر کرنا چاہتا ہے۔ جگہ تلاش اور جدوجہد کے اس عمل میں وہ اپنی سب صلاحیتوں کا منبع، توفیقِ خداوندی کو ہی قرار دیتا ہے اور یوں ایک عظیم ترین ہستی سے وابستہ ہونے کے احساس کے باعث احساسِ تنہائی سے بھی بچ جاتا ہے اور اس کی نگاہ میں بھی زیادہ وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔ میرا اشارہ اس مثبت تصوف کی طرف ہے۔ جو ہمیشہ ایک حیات بخش نظریہ رہا ہے اور اسلامی تصوف کی بنیادی رُوح بھی یہی ہے۔ اصحابِ صفہ سے علامہ اقبالؒ تک ہمیں بے شمار درخشندہ مثالیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ رومیؒ اور غزالیؒ کا یہ تصوف دنیا کے کسی بھی نظامِ فکر اور طرزِ حیات سے فروتر نہیں اور یہ ایک نخلِ سدا بہار ہے جس کو ہر بدلتے ہوئے دور میں قائم و دائم رہنا چاہیے۔

میرا اصل موضوع دورِ حاضر میں احیائے تصوف کی ضرورت ہے۔ اور اب تک جو لکھا گیا ہے وہ محض ایک مختصر سی تمہید ہے مگر اسی تمہید میں ہی نفسِ مضمون کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اصل بات تشنۂ تکمیل رہ گئی ہے اور ان شاء اللہ آئندہ کسی شمارے میں اس موضوع پر مزید خامہ فرسائی کروں گا۔

یادِ رفتگاں

سید عون علی الموسویؒ

تحریر: مسرورِ کہستانی

سنہ ۱۹۹۱ء کو خادمِ ملت حاجی الحرمین سید عون علیؒ مختصر علالت کے بعد اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ وہ سلسلۃ الذہب کی ایک کڑی تھے۔ پیر صاحب کے بارے میں کچھ لکھنے سے پیشتر نوربخشی مسلک کا مختصر تعارف ضروری معلوم ہوتا ہے۔ جس کے وہ روحانی پیشوا تھے۔ نوربخشی سلسلہ میں بھی تصوف کے دیگر سلسلوں کی طرح آدم الاولیاء حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جا ملتا ہے۔ شیخ حضرت معروف کرخیؒ نے حضرت امام علی رضاؑ کے آستانۂ اقدس سے کسبِ فیض کیا تھا۔ انہی کی ذاتِ گرامی سے تصوف کا وہ مشہور و معروف سلسلہ جو سلسلۃ الذہب کہلاتا ہے۔ اس سلسلے کے عظیم بزرگ شاہ ہمدان سید علی ہمدانیؒ نے جنہیں اپنے روحانی کمالات کی بناء پر علی ثانی بھی کہتے ہیں۔ پورے کشمیر اور بلتستان میں اسلام کو فروغ دیا۔ شاہ ہمدان نے اپنا خرقہ خواجہ اسحٰق ختلانی کو عطا کیا تھا جو شاہ سید محمد نوربخش قہستانیؒ کے پیر و مرشد تھے مگر اپنے مرید کے روحانی مقام کو بھانپتے ہوئے انہوں نے خلافتِ باطنی کا تاج ان کے سر پر رکھ دیا اور خود اپنے مرید کے مرید بن گئے۔ شاہ سید محمد نوربخشؒ تمام علوم ظاہری و باطنی میں درجۂ کمال کو پہنچے ہوئے تھے انہوں نے اپنے پیشرو بزرگوں کی طرح اشاعتِ دین کی خاطر بہت سی تکالیف برداشت کیں اور قید و بند کی مشکل بھی جھیلی اور اشاعتِ دین ہی کی خاطر قلمی جہاد بھی کیا اور شریعت محمدیہؐ کی صحیح ترین شکل کو "الفقہ الاحوط" کے نام سے کتابی صورت میں ہمیشہ کے لئے محفوظ کیا اس کے علاوہ ایمان اور اعتقاد کے موضوع پر بھی ایک مختصر مگر جامع رسالہ کتاب الاعتقادیہ کے نام سے تحریر کیا شاہ سید محمد نوربخش کے معتقدین آج بھی ہزاروں کی تعداد میں بلتستان ایران اور گرد و نواح کے علاقوں میں موجود ہیں۔

یہاں ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ سید نوربخشؒ نے اسلام میں ایک نئے فرقے کو رواج دیا چنانچہ کچھ کوتاہ نظر لوگ "فرقہ نوربخشیہ" کی اصطلاح بھی استعمال کرتے نظر آتے ہیں۔ حقیقتِ حال یہ ہے کہ شاہ سید علیہ الرحمۃ نے بدعتوں کو ختم کر کے شریعت محمدیہؐ کو اس کی اصلی صورت میں دوبارہ رواج دینے کی کوشش کی تھی یہ بات صاحبِ شعور حضرات سے پوشیدہ نہیں ہے کہ تمام بڑے صوفیا فرقہ بندی کی قید سے آزاد تھے۔ چنانچہ مولانا رومیؒ، شیخ سعدی شیرازیؒ، امام غزالیؒ اور خود شاہ ہمدانؒ سید علی ہمدانیؒ کے مسلک کے بارے میں متضاد دعوے کئے جاتے ہیں۔ کوئی فر

انہیں کسی امام کے پیروکار قرار دیتا ہے تو کوئی کسی کے۔ حالانکہ ان بزرگوں کا روحانی اور علمی مقام اتنا ارفع تھا کہ کسی محدث یا فقیہ کی محدود تقلید کے وہ حاجت مند نہیں تھے۔

انہیں براہِ راست ام الکتاب یعنی قرآن مجید کے معانی و مفاہیم تک رسائی تھی اور سیرتِ طیبہ سے اتنے باخبر تھے کہ گویا انہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے ہر پہلو کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہو۔ چنانچہ علومِ دین میں انہیں کسی توسط کا احتیاج نہیں تھا۔ شاہ سید نوربخش کا شمار بھی ایسے ہی صوفیا میں ہوتا ہے۔ انہوں نے بھی اس خزانۂ علمی کو جو بلا کم و کاست سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا ہوا ان تک پہنچا تھا۔ صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا۔ یہ سوال بھی کئی ذہنوں میں ابھرتا ہے کہ شاہ سید علیہ الرحمہ سے پہلے سید علی ہمدانی نے یا سلسلۃ الذہب کے کسی اور بزرگ نے فقہی معاملات پر کوئی کتاب لکھنے کی ضرورت کیوں محسوس نہ کی اور شاہ سیدؒ کے زمانے میں ہی یہ کام کیوں ناگزیر ہو گیا۔ ؟ ہمارے فہمِ نارسا میں اس سوال کا یہ جواب آتا ہے کہ ایک تو اتنا طویل وقت گزرنے کے بعد دینِ اسلام میں کئی بدعتیں رواج پا چکی تھیں۔ جن کا قلع قمع کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ دوسرے آنے والا زمانہ بتدریج روحانی انحطاط کا تھا اور آنے والے ادوار کے مسلمان اس خزانۂ علمی کی روحانی وراثت کے اہل نہ ہو سکتے تھے اس لئے اس کو صفحۂ قرطاس پر نقل کرنا ضروری ہو گیا تاکہ بعد کے لوگ بآسانی اس سند سے استفادہ کر سکیں۔

یہاں میرا مقصد یہ کہنا ہرگز نہیں کہ خدانخواستہ علمِ دین اور علمِ حدیث و فقہ میں دوسرے آئمہ نے جو تحقیق کی وہ درست نہ تھی۔ بلکہ ہر امام نے حسبِ مقدور نیک نیتی کے ساتھ فروغِ اسلام اور ترویجِ دینِ مبین کی سعی کی ہے۔ البتہ ان کے پیرو بدقسمتی سے تنگ نظری اور فرقہ پرستی کا شکار ہوئے اور ان بزرگوں کی تعلیمات کے صرف چند پہلوؤں کو لے کر بیٹھ گئے اور اختلافات کو ہوا دی گئی ورنہ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود فرمایا ہے کہ میری اُمّت میں اختلاف باعثِ رحمت ہے اور یہاں پہ اختلاف کا مطلب فرقہ ورانہ دنگا فساد نہیں بلکہ تعمیری تنقید اور تحقیق و جستجو ہے۔

بات طویل ہو گئی۔ اصل بات پیر صاحب کی یاد میں دو لفظ لکھنا تھا۔ بہرحال ایک طرح سے ان کی ذات اور منصب کا تعارف بھی ہو گیا۔ اجمالاً اتنا کہنا ضروری ہے کہ شاہ ہمدان امیر کبیر سید علی ہمدانی اور شاہ سید محمد نوربخش علیہ الرحمۃ کے بعد ان کے خلفا کئی سو برس تک ان کی تعلیمات کا پرچار کرتے رہے اور اگرچہ بدقسمتی سے روحانیت کو بتدریج زوال آتا گیا اور خانقاہوں اور چلہ خانوں میں وہ رونق نہ رہی، اب بھی لوگ ریاضت اور عمل سے بالکل بے گانہ نہیں اور ان بزرگوں کے بتائے ہوئے اوراد و وظائف اب بھی مقبولِ عام ہیں۔

شاہ ہمدان علیہ الرحمۃ اور شاہ سید علیہ الرحمہ کے مبارک ادوار کے بعد سے اگرچہ سیاسی، معاشی اور مذہبی انقلابات کے نتیجے میں تصوف اور ریاضت کی وہ گرم بازاری نہیں رہی، لیکن رشد و ہدایت کا کام بہرحال کسی نہ کسی صورت چلتا رہا۔ ہمارے دور میں بلتستان کے علاقے میں یہ ذمہ داری منتقل ہوتی ہوئی سید عون علیؒ تک پہنچی تھی اور ان کا منصب اس لحاظ سے ہر طرح لائقِ احترام و عقیدت ہے کہ اس راستے پر چلتے ہوئے ہم اگر ماضی کی سمت سفر شروع کر دیں تو شاہ ہمدان علیہ الرحمۃ کے

دور دراز تک پہنچتے ہیں۔

سید عون علی صاحب سید محمد شاہ مخدوم الفقراء کے بعد ان کے خلیفہ بنے۔ انہوں نے علومِ شرعی میں اپنے وقت کے مشہور علماءؒ کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیا تھا اور بچپن سے ہی لہو و لعب سے دُور رہے تھے۔ اپنی وفات تک وہ بلتستان کے مرکزی علاقہ خپلو کی مرکزی خانقاہِ معلیٰ کے امامِ جمعہ رہے۔ بسا اوقات رشد و ہدایت کے سلسلے میں مضافات میں بھی تشریف لے جاتے ازراہِ عجز و انکسار اپنے نامِ گرامی کے ساتھ "خادمِ ملت" کے الفاظ ضرور لکھتے تھے وفات سے کچھ سال قبل مقاماتِ مقدسہ کی زیارت سے مشرف ہوئے یہ ان کے لئے زندگی کی سب سے بڑی کامیابی اور قابلِ فخر بات تھی۔ چنانچہ حاجی الحرمین کہلانے میں بھی خوشی محسوس کرتے تھے۔

پیر صاحب نے ہمیشہ درویشانہ زندگی گزاری۔ ایک معمولی سے کچے مکان میں تشریف رکھتے تھے اور کسبِ حلال کی خاطر کھیتی باڑی کا پیشہ اختیار کر رکھا تھا۔ خپلو کی ایک پہاڑی کے دامن میں انہوں نے اپنی جسمانی محنت سے تھوڑی سی زمین قابلِ کاشت بنالی تھی۔ ان کھیتوں میں لہلہانے والی شاداب فصلوں میں ایک درویش کی روحانی شگفتگی کی جھلک ہمیشہ نظر آتی رہے گی۔

پیر صاحب نہائیت کم گو اور صلح جو طبیعت کے مالک تھے ساری زندگی انہوں نے کبھی کوئی ایسی بات نہ کہی جس سے تعصب کا پہلو نکلتا ہو۔ اکثر فتنہ انگیز بحث و مباحثوں میں خاموشی اختیار فرماتے اور جب بھی کوئی بات کرتے وہ اتحاد بین المسلمین کی ہوتی۔ عالمانہ وقار ایسا تھا کہ ان کی محفل میں بڑے بڑے علماء بھی عقیدت و احترام کی تصویر بنے نظر آتے تھے۔ فنِ خطابت میں بڑا ملکہ حاصل تھا اور بات ہمیشہ علمی حوالوں کے ساتھ اور دلنشیں انداز میں کرتے تھے۔ مستقل مزاج تھے اور بحرانوں میں بھی ہمیشہ پرسکون رہے بلتستان کے مسلمانوں کے لئے ان کی شخصیت احساسِ یگانگت کی علامت اور تسکینِ قلب کا محور تھی۔

حج کے سفر میں بھی ہر مقام پر ہزاروں افراد نے ان کا والہانہ استقبال کیا تھا۔ لیکن ان کی ذاتِ گرامی سے لوگوں کی عقیدت کا صحیح اندازہ ان کی وفات کے بعد ہوا...... کہ جب علم کا چراغ گُل ہوا تو ہر طرف صفِ ماتم بچھ گئی اور ہزاروں آنکھیں اشکبار ہوئیں۔ اسلام آباد ہسپتال سے ان کی نعش مبارک کو مسجدِ نوربخشیہ میں لایا گیا تھا۔ لوگ اس طرح بے اختیار گریہ و زاری کر رہے تھے جیسے انہیں پہلی مرتبہ روحانی طور پہ اپنے یتیم اور بے سہارا ہونے کا احساس ہوا ہو۔ گلگت، چیلاس، سکردو، کریس اور خپلو کے مقامات پر ہزاروں افراد اپنا کاروبارِ زندگی چھوڑ کر پروانہ وار ان کے آخری دیدار کو اُمڈ آئے تھے۔ شمالی علاقہ جات کی تاریخ میں کسی بھی شخصیت کی موت کا اس سے زیادہ ماتم نہیں کیا گیا تھا اور یہ بات خاص طور پہ قابلِ توجہ ہے کہ ہر فرقے اور مسلک کے پیروکار ان کے سوگواروں میں شامل تھے۔

اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ عنائیت فرمائے۔ آمین!

خط و کتابت کے لیے:
G-7/4
نشر و اشاعت، انجمن محمدیہ بلتستانیہ (رجسٹرڈ) اسلام آباد

سیّد عون علی کی یاد میں

مردِ کہستانی

وہ گوشہ گلستاں کا بہت سوگوار تھا — جس جا جنابِ عون علیؒ کا مزار تھا

پت جھڑ تھی آنسوؤں کی اُسی کی وفات پر — جس کا وجود وجہِ ثباتِ بہار تھا

وہ چہرہ آہ خاک کی چادر میں چھپ گیا — جس کے سبب سے چہرۂ گل پر نکھار تھا

معلوم سبکو اس کی ہے سیرت کی خوبیاں — کم گو، حلیم طبع، عبادت گزار تھا

لاکھوں عقیدتوں کا تھی محور اُسی کی ذات — پھر بھی مزاجِ عالی میں کیا انکسار تھا

لاکھوں دلوں پہ اس کی حکومت تھی یہ کُھلا — جو انتظامِ شہر میں کم اختیار تھا

دائم ہی اُس کا قیدِ قناعت میں نفس تھا — خواہش کی چاروں سمت غنیٰ کا حصار تھا

دنیا سے اس نے دل کو لگایا نہ تھا کبھی — اپنے دیار میں بھی غریب الدیار تھا

رہتا تھا اہلِ شوکت وسطوت سے بے نیاز — غم خوار بے کسوں کا، غریبوں کا یار تھا

نازاں وہ اپنے علم ونسب پر نہ تھا فقط — خدمت پہ دیں کی فخر کا اُس کے مدار تھا

عشقِ نبیؐ تھا اُس کے لہو میں گھلا ہوا — حُبِّ علیؑ کا رُوح پہ طاری خمار تھا

تھے اس کے رہنما شہِ ہمدانؒ و نور بخشؒ — پیشِ نظر وہی تھا جو اُن کا شعار تھا

طرزِ حیات اس کی اگرچہ تھی بے مثال — لیکن حیات کا نہ کوئی اعتبار تھا

آخر وہ چہرہ خاک کی چادر میں چھپ گیا — جس کے سبب سے چہرۂ گل پر نکھار تھا

ہے آج روئے مردِ کہستاں خزاں زدہ
جو اس کی زندگی میں سدا پُر بہار تھا

مجموعۂ شریعت محمدیہ ﷺ

تحریر
علامہ محمد بشیر

گذشتہ سے پیوستہ

اشکال نمبر ١ اور اس کا جواب

اشکال یوں تھا کہ وضو کی نیت میں لرفع الحدث یعنی حکمی ناپاکی دُور کرنے کا ذکر ہے۔ پیروں کو واجب نمبرہ کی حیثیت سے دھونے میں نیت کی خلاف ورزی سامنے آتی ہے۔ اس اشکال میں حدث کو صرف حکمی ناپاکی پر محمول کیا گیا ہے۔ حالانکہ مطلق حدث اپنی دونوں قسموں یعنی عینی ناپاکی اور حکمی ناپاکی دونوں کو شامل ہے۔ نیت میں مطلق حدث کا ذکر کیا جاتا ہے۔ صرف حکمی ناپاکی دُور کرنے کا تذکرہ نہیں کیا جاتا۔ اگر ایسا ہوتا تو نیت میں لرفع الحدث الحکمی کہنا ضروری ہوتا ہے حالانکہ کہیں بھی اس قید کا تذکرہ وضو کی نیت میں موجود نہیں ہے۔ لہٰذا پیروں کو ناپاکی کی صورت میں دھونے سے نیت کی کوئی خلاف ورزی لازم نہیں آتی بلکہ یہ عین تقاضائے نیت ہے۔

اشکال نمبر ٢ اور دوسرا جواب

اشکال یوں تھا کہ اس فقہی عبارت یعنی "وان کان علیٰ ظاھر بدنک نوث؟ وجبت ازالۃ" سے اعضائے وضو کا قبل از وضو پاک کرنا واجب ثابت ہوتا ہے۔ لہٰذا پیروں کو وضو کے واجب نمبرہ بنا کر دھونا ایک واجب حکم کی خلاف ورزی ہے۔ ان اشکال میں جس فقہی عبارت کو بنیاد بنا دیا گیا ہے وہ دراصل غلط فہمی کا نتیجہ ہے۔ اس عبارت مذکورہ میں اعضائے وضو کا قبل از وضو پاک ہونے کی طرف اشارہ تک نہیں چہ جائیکہ ایسا کرنا واجب ہو۔ ہاں وضو اور غسل سے قبل استنجا اور استبرا پر عمل پیرا ہونا یقیناً واجب ہے اور اس کا تذکرہ بھی وضاحت سے کیا گیا ہے۔ اعضائے وضو اور ہر عضو کا حکم بھی اپنی اپنی جگہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس اشکال میں جو عبارت پیش کی گئی ہے وہ دراصل نماز کی شرائط میں سے ہے۔ چونکہ ناپاکی دُور کرنے کا بیان چل رہا تھا۔ لہٰذا صحت نماز کیلئے بدن اور کپڑوں کا پاک ہونا شرط ہے۔ چنانچہ طہرۃ اللباب باب الطہارت میں بھی اس کا تذکرہ کیا گیا۔ اگر اشکال والی بات درست ہوتی تو وجبت ازالۃ کے بعد قبل الوضو کا لفظ بھی آنا چاہیئے تھا۔ حالانکہ الفقہ الاحوط کے کسی بھی مطبوعہ یا غیر مطبوعہ نسخے میں اس کا ثبوت موجود نہیں ہے۔ پس معلوم ہوا کہ مذکورہ عبارت کا تعلق صحتِ وضو سے بالکل نہیں ہے۔

اشکال نمبر ٣ اور اس کا جواب

اشکال یوں تھا کہ وضو کا پانی خود پاک ہے اور پاک کرنے والا نہیں۔ ناپاک پیر کو وضو کے مواجب نمبرہ کی شکل

ہی دھونے سے یہ بات غلط ہو جاتی ہے۔ یہ اشکال بھی غلط بیانی پر مبنی ہے۔ فقہ احوط میں کہیں بھی یہ بات مذکور نہیں ہے کہ وضو کا پانی خود پاک ہے اور پاک کرنے والا نہیں۔ بلکہ ہر سلسلے میں فقہ احوط میں جو حکم مذکورہ ہے وہ یوں ہے۔

والماء اذا استعمل فی غیر ازالۃ النجاسۃ اعنی لرفع الحدث الحکمی فی الطہارتین فھو طاھرٌ غیر مطھرٍ۔

یعنی : پانی کا استعمال اگر غیر ازالہ نجاست کے لئے کیا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ وضو اور غسل میں حکمی ناپاکی دور کرنے کی صورتوں میں استعمال کیا گیا ہو وہ پانی خود پاک ہے اور اگر کسی ناپاک چیز کو پاک کرنے والا نہیں۔ اگر اشکال والی بات وزنی ہوتی تو عبارت یوں ہوتی۔

ماءُ الطہارتین طاھرٌ وغیر مطھرٍ

یعنی وضو اور غسل کا پانی خود پاک ہے اور پاک کرنے والا نہیں حالانکہ ایسا کہیں بھی نہیں ہے۔ وضو اور غسل میں حکمی ناپاکی دور کرنے والی جو جو صورتیں ہیں۔ ان صورتوں میں استعمال شدہ پانی یقیناً خود پاک ہے کسی ناپاک چیز کو پاک کرنے والا پانی نہیں۔ پیروں کو دھونے کی جو صورت ہے وہ ازالہ نجاست کی صورت ہے۔ لہٰذا وہ پانی سے حکم سے خود بخود مستثنیٰ ہے۔

لزوم بطلان

اگر اشکال کی مذکورہ صورتوں کو تھوڑی دیر کے لئے درست مان لیا جائے تو اس کے نتیجہ میں الفقہ الاحوط میں وضو کے جب نمبرہ کے جزو لاینفک کے طور پر متفقہ طور پر موجود یہ عبارت

او غسلھما الی الکعبین کا سراسر لغو ہونا لازم آتا ہے جو واضح طور پر باطل ہے۔ لہٰذا اشکال کی جو جو صورت مستلزم جہل ہو وہ بجائے خود باطل ٹھہرتی ہے۔ پس اشکال کی جو تین صورتیں پیدا کی گئی ہیں وہ از روئے شریعت محمدیہ بطلان پر مبنی ہیں

مزید وضاحت کے لئے قارئین کرام، نوائے مؤمن قسط نمبر ۲ کا بار بار مطالعہ کریں تاکہ اس سلسلے میں پوری حقیقت کھل کر سامنے آسکے۔

واما سننھا فالمضمضۃ والاستنشاق وکل واحد منھما بغرفۃ مرۃً او مرتین ویجوز المبالغۃ فیھما من غیر الصوم وتکرار غسل الوجہ والیدین مرتین ولا یتجاوز من ثلاث والسواک طولاً وعرضاً ان وسع الوقت وان ضاق فاحدھما ویجوز بکرباس خشن او بالاصابع ان لم یحضر الخشبی والبسملۃ فی الابتداء وان نسیت ففی الاثناء واستیعاب الراس بالمسح فی الازمنۃ والامکنۃ الحارۃ ومسح

ظاهر اذنیک وتخلیل باطنهما
ومسح الرقبة فی الریاح لدفع الغبار
ببلل ما تقدم وان لا نستعین فی
الوضوء بغیرک الا لضرورة وترک
التمندل ان لم تخف من الغبار و
لصوق مالم تستیقن بطهارته من
الارض والحصیر والبواری لان
یبسها طهرها والا فتمندل ہ

ترجمہ : وضو کے مسنون افعال یہ ہیں۔

۱۔ کلی کرنا۔

۲۔ ناک میں پانی ڈالنا۔ یہ دونوں فعل ایک چلو بھر پانی سے ایک ہی مرتبہ یا دو مرتبہ کرے۔ روزے کی حالت کے سوا دونوں فعل کی بجاآوری میں مبالغہ سے کام لینا جائز ہے۔

۳۔ منہ اور ہاتھوں کا مکرر دھونا۔ مگر یہ کام تین بار سے تجاوز نہ کر جائے۔

۴۔ لمبائی اور چوڑائی دونوں میں دانتوں کا مسواک کرنا۔ اگر وقت میں اس کی گنجائش موجود ہو۔ اگر وقت تنگ ہو تو صرف ایک شکل پر عمل کرنا اگر لکڑی کی مسواک نہ ملے تو کھردرے کپڑے یا انگلیوں سے بھی مسواک کرنا جائز ہے۔

۵۔ وضو کے آغاز میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ کا پڑھنا بھول جائے تو دوران وضو اس کا پڑھنا۔

۶۔ گرم علاقوں اور گرمی کے ایام میں پورے سر کا مسح کرنا۔

۷۔ کانوں کے باہر کے حصے کا مسح کرنا اور اندر کے حصے کا خلال کرنا۔

۸۔ ہوائیں چلنے کی صورت میں غبار کو ہٹانے کی خاطر گردن کا مسح کرنا۔

۹۔ کسی خاص ضرورت کے بغیر کسی دوسرے سے وضو کرنے کے بارے میں مدد نہ لینا۔

۱۰۔ اگر غبار پڑنے اور کسی ایسی چیز کے لگ جانے کا اندیشہ نہ ہو جس کی پاکی میں آپ کو یقین نہیں ہے، جیسے زمین چٹائی اور بوریاں، کیونکہ ان چیزوں کا خشک ہو جانا ان کے لئے باعث پاکی ہے تو ایسی صورت میں رومال کا استعمال چھوڑ دینا اگر معاملہ اس قسم کے اندیشہ سے خالی نہ ہو تو آپ رومال استعمال کریں۔

ضروری وضاحت:

فقہ احوط میں وضو کے کل پندرہ مسنون افعال کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہاں پر ان مسنون افعال میں سے دس مسنون افعال کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان مسنون افعال میں بعض مسنون افعال وہ ہیں جو دراصل مبادیات وضو ہیں۔ تاہم مبادیات وضو بھی وضو کے مسنون افعال ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ وضو کے واجب افعال کے آغاز سے قبل بھی بعض مسنون افعال بجا لائے جاتے ہیں اور واجب افعال کے آغاز کے بعد بھی بہت سے مسنون افعال بجا لائے جاتے ہیں۔ وضو کے واجب افعال کے آغاز سے پہلے جو جو فعل مسنون ہے وہ یہ ہیں۔

۱۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیمؒ کا پڑھنا۔

۲۔ مسواک کرنا۔

۳۔ کلی کرنا۔

۴۔ ناک میں پانی ڈالنا۔

خوب آگاہ رہے کہ وضو کی بجا آوری کے بارے میں بزرگانِ دین کا عملی تواتر یوں چلا آتا ہے کہ اگر مسواک کرنا ہے تو بسم اللہ کے بعد اس پر عمل کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد دونوں ہاتھوں کو کلائیوں سمیت دھویا جاتا ہے۔ پھر کلی کی باری آتی ہے اور کلی کے بعد ناک میں پانی ڈالنے کا مسنون فعل بجا لایا جاتا ہے۔

اگر مسواک والی سنت پر عمل پیرا نہ ہو سکے تو بسم اللہ کے بعد ہاتھوں کو کلائیوں سمیت دھونے کی صورت پر عمل کیا جاتا ہے۔ پھر کلی کی جاتی ہے اور کلی کے بعد ناک کی باری آتی ہے۔ اگرچہ فقہ احوط میں وضو کے مسنون افعال میں ہاتھوں کو کلائیوں سمیت دھونے کا ذکر نہیں کیا گیا تاہم روایاتِ صوفیہ میں اس کا تذکرہ موجود ہے اور خیر القرآن سے لے کر تا حال امتِ مسلمہ کا تواترِ عملی اس کے مسنون ہونے کا شاہد ہے نیز ہاتھوں کو ایک ایک بار دھونے سے واجب فعل سے آدمی سبک دوش ہو جاتا ہے۔ مزید دو بار مکرر دھونا مسنون قرار پاتا ہے۔ دھونے کا یہ عمل کل تین بار سے آگے نہ جانا چاہیئے یہی متشرع طریقہ چلا آتا ہے۔ اگر تین بار سے زائد دھوئے جائیں تو یہ خلافِ سنت فعل ٹھہرے گا۔

بدلتے حالات کی قید

وضو کے مسنون افعال کی فہرست میں مندرجہ ذیل تین مسنون افعال کا ذکر کیا گیا ہے۔

۱۔ پورے سر کا مسح کرنا۔

۲۔ کان کے باہر والے حصے کا مسح کرنا اور اندر کے حصے کا خلال کرنا۔

۳۔ گردن کا مسح کرنا۔

بعض مکاتبِ فکر والوں کے ہاں مذکورہ تینوں مسنون افعال بلا کسی قیدِ حالت کے مطلقاً مسنون ہیں۔ مجموعۂ شریعتِ محمدیہ الفقہ الاحوط کی رُو سے یہ تینوں مسنون افعال حالات کے تقاضے کے ساتھ مقید مسنون افعال ہیں۔

چنانچہ گرم علاقوں کے لئے پورے سر کا مسح کرنا مسنون ہے اسی طرح گرمی کے موسم میں پورے سر کا مسح کرنا مسنون ہے جہاں پورے سر کا مسح کرنا مسنون ہے وہاں پر کان کے اندرونی حصے کا خلال کرنا اور باہر کے حصے کا مسح کرنا بھی مسنون ہیں

غبار کو ہٹانے کی خاطر گردن کا مسح کرنا بھی مسنون ہے۔ گرد و غبار کا لگ جانا خواہ ہوائیں چلنے کی وجہ سے ہو یا کسی اور سبب سے گرد لگ جائے دونوں صورتوں میں گردن کا مسح کرنا مسنون ہے۔

مسح کرنے کی ان مذکورہ صورتوں میں جدید پانی لینے کی ضرورت نہیں بلکہ وضو کی سابقہ تری جو ہاتھوں کے ساتھ لگی ہوئی ہوتی ہے اُسی تری سے مسح کرنا چاہیئے۔

وضو کر چکنے کے بعد تری کو خشک کرنے کے لئے رُومال کا استعمال نہ کرنا مسنون ہے۔ ایسا کرنا اس صورت میں ہے جبکہ نمازی کو غبار پڑنے کا خوف نہ ہو۔ اسی طرح سے جائے نماز پر سے کوئی ایسی چیز گیلی پیشانی اور تر ہاتھوں پر نہ لگ جاتی ہو، جس کے پاک ہونے میں نمازی کو یقین نہ ہو تو ایسی صورت میں رُومال کا استعمال ترک کرنا سنّت ہے۔ اگر گرد و غبار گرنے کا اندیشہ ہو، یا جائے نماز پر سے کوئی ناپاک شے کے لگ جانے کا احتمال ہو مثلاً زمین، چٹائی اور بوری پر نماز پڑھنے کی صورت میں جب کہ ان چیزوں کے پاک ہونے کا یقین نہ ہو تو ایسی صورت میں ضرور رومال کا استعمال کر کے، وضو کی تری کو خشک کر دینا مسنون ہے۔

جاری ہے

اِظہارِ تشکّر

ہم

اراکینِ انجمن نوربخشیہ
اِسلام آباد

جناب علامہ محمد بشیر ٥ جناب فاچو محمد امین
جناب علی احمد قمر ٥ ڈاکٹر نعیم غازی
اور جناب غلام حسین معروفی کے تہہ دل سے مشکور ہیں جن کی کوششوں سے نوائے صوفیہ کا دوبارہ اجراء عمل میں آیا
امید ہے ان سب کا تعاون ہمیشہ ہمارے ساتھ رہے گا۔
منجانب: محمد سلیم جنرل سیکریٹری انجمن محمدیہ بلتستانیہ
اِسلام آباد

فقہی مسائل

تحریر: علامہ محمد بشیر

عنوانِ بالا کے تحت فقہی مسائل سے تعلق رکھنے والے سوالات کے جوابات دیئے جاتے ہیں۔ اس عنوان کی غرض وغایت نوائے صوفیہ قسط نمبر ۳ میں واضح طور پر بیان کی جا چکی ہے۔ چونکہ مسائل اوران کا حل ہر فردِ مومن مسلمان کی آرزوئے دل ہے۔ دل کی تمنا پوری نہ ہو جائے تو انسان ہر وقت اضطرابی کیفیت کا شکار رہتا ہے۔ چنانچہ اس وقت ہم قارئین کی خدمت میں ایک اہم سوال اور شریعتِ محمدیؐ کی رو سے اس کا حل یعنی جواب پیش کرتے ہیں۔

سوال: ٹریفک کے حادثات میں کبھی قیمتی جانیں ضائع ہو جاتی ہیں کبھی متصادم افراد شدید زخمی ہو جاتے ہیں اور کبھی صرف متصادم گاڑیوں کو نقصان پہنچتا ہے اور آدمی محفوظ

رہ جاتے ہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دونوں متصادم گاڑیوں میں سے صرف ایک گاڑی کو نقصان پہنچتا ہے اور دوسری گاڑی صحیح سالم حالت میں رہ جاتی ہے۔ ان دونوں صورتوں میں شریعت کیا حکم صادر فرماتی ہے۔!

سوال کنندہ:

موسیٰ خان، سپاہی پنشنر

اسلام آباد

جواب: سوال مذکورہ چار صورتوں پر مشتمل ہے۔ ہر صورت کا الگ الگ شرعی حکم ہوگا۔ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ ٹریفک کے حادثات عموماً اضطراری حالت میں پیش آتے ہیں۔ ان حادثات میں موت کا وقوع پذیر ہونا بھی ہے۔ زخمی ہونا بھی ہے اور مال کا نقصان بھی ہے۔ کوئی عقلمند فرد دانستہ طور پر ان حالات کا وقوع سرے سے چاہتا ہی نہیں۔ نیز ان حادثات پر اقسام قتل کی کوئی تعریف پوری طرح صادق نہیں آتی۔ چنانچہ شریعت محمدیہ میں اس کے لئے ایک ضابطہ کلیہ موجود ہے اسی کے مطابق جزئی واقعات کا حکم معلوم کیا جا سکتا ہے۔ ضابطہ کلیہ یہ ہے۔

ولو تصادم فارسان او راجلان
و ھلکا فلورثۃ کل منھما نصف
الدیۃ ولو ھلک واحدٌ فلورثۃ
علی الباقی نصف الدیۃ ٥

ترجمہ: اگر دو سواروں یا دو پیدل چلنے والوں کا آپس میں تصادم ہو جائے اور دونوں کے دونوں ہلاک ہو جائیں تو دونوں میں سے ہر ایک کے وارثوں کو آدھی آدھی دیت ملے گی۔

اور اگر ان میں سے صرف ایک مر جائے تو اس کے وارثوں کیلئے دوسرے کے ذمہ پر (جو مرنے سے رہ گیا) دیت کا نصف حصہ دینا لازم ہوگا۔ مجموعہ شریعت محمدیہ الفقہ الاحوط کے باب القصاص میں موجود یہ ضابطہ کلیہ ٹریفک کے حادثات کے نتیجے میں رونما ہونے والے حالات پر فیصلہ صادر کرنے کیلئے رہنما اصول فراہم کرتا ہے۔ چنانچہ سوال مذکورہ کی مختلف صورتوں کا شرعی حل یعنی جواب معرض تحریر میں لایا جاتا ہے۔

نمبر ا: دونوں سوار افراد ہلاک ہو جانے کی صورت میں ہر ایک کے وارث لوگ دوسرے کے وارث لوگوں سے آدھی دیت وصول کرنے کے حقدار ہوں گے۔ چونکہ حساب دونوں جانب کا یکساں بیٹھتا ہے۔ لہٰذا اس صورت میں عملاً کسی کی طرف سے کسی کو کچھ دینے کی نوبت نہیں آئے گی۔ واضح رہے کہ ٹریفک کے حادثات کی صورت میں آدھی دیت لازمی ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں پر اس امر کا ثبوت نہایت دشوار کام ہے کہ ٹریفک کی خلاف ورزی کس کی طرف سے ہوئی ہے یا کس کی طرف سے نہیں ہوئی لہٰذا شریعت محمدیہ نے عام حکم صادر کر دیا ہے کہ آدھی دیت لازم ہوگی۔

مساواتِ وجودی

صورت نمبر ا کا جواب مذکورہ اس صورت میں ہے۔ جبکہ دونوں ہلاک شدگان ایک ہی جنس کے ہوں دونوں کے دونوں مرد ہوں یا دونوں کی دونوں عورتیں ہوں۔ اگر ہلاک شدہ افراد میں سے ایک فرد عورت ہو تو از روئے شریعت محمدیہ عورت کی دیت مرد کی دیت کا نصف حصہ ہے۔ مرد کی دیت سو اونٹوں کی ہے۔ عورت کی دیت پچاس اونٹوں کی۔ لہٰذا اس صورت میں ہلاک شدہ عورت کے وارث لوگوں کو ہلاک شدہ مرد کے وارث لوگوں سے عورت کی دیت کا نصف حصہ یعنی پچیس اونٹوں کی دیت ملے گی۔ ہلاک شدہ مرد کے وارث لوگوں کو ہلاک شدہ عورت کے وارث لوگوں سے پچاس اونٹوں کی دیت ملے گی پچیس اور پچیس برابر ہوں گے اور عملاً صرف پچیس اونٹوں کی دیت مرد کے وارث لوگوں کو ملے گی۔

نمبر ۲: اگر دونوں متصادم سوار افراد ہلاک نہ ہوں بلکہ زخمی ہوں تو اس صورت میں زخم کی شدت اور خفت کے مطابق مناسب معاوضہ بطور دیت لازم ہو جائے گا۔ اگر ایک کو زخم شدید آیا ہو اور دوسرا زخم خفیف والا ہو تو شدید زخم والے کو خفیف زخم والے سے بقدر شدت زیادہ معاوضہ بطور دیت زخم ملے گا۔ فیصلہ عادل ماہرین کریں گے۔

نمبر ۳: اگر دونوں متصادم گاڑیاں نقصان سے متاثر ہوں تو اگر نقصان برابر برابر ہو تو عملاً کسی ایک کو دوسرے سے کچھ نہیں ملے گا کیونکہ معاوضہ بھی برابر برابر ہوگا۔ اگر ایک گاڑی کا نقصان زیادہ ہو تو زیادہ کی مقدار کا معاوضہ دوسرے سے ملے گا۔ یہاں پر نقصان کا اندازہ ورکشاپ میں دونوں کی مرمت پر اٹھنے والی لاگت سے کیا جائے گا۔

نمبر ۴: اگر دونوں متصادم گاڑیوں میں سے صرف ایک گاڑی نقصان سے متاثر ہوئی ہو اور دوسری گاڑی بالکل صحیح حالت میں محفوظ رہ گئی ہو تو نقصان زدہ گاڑی والے کو دوسری گاڑی والے سے نقصان کا مناسب معاوضہ ملے گا۔ اگر ٹریفک کے قوانین اور قواعد و ضوابط کی کھلی خلاف ورزی نقصان زدہ گاڑی والے کی طرف سے ہوئی ہو اور اس کا ٹھوس شرعی ثبوت بھی مہیا ہو جائے تو اس صورت میں اس کو کچھ معاوضہ نہیں ملے گا۔ خلاف ورزی کے ثبوت پر مرتب ہونے والا یہی حکم صورت نمبر ۲ اور صورت نمبر ۳ کا بھی ہے۔ صورت نمبر ا میں چونکہ اصل وغیرہ دونوں جانب موجود نہیں کیونکہ سوار افراد ہلاک ہوئے ہوتے ہیں۔ وارثوں کی طرف سے کسی ایک جانب کی خلاف ورزی وغیرہ کا ثبوت شرعاً فراہم ہونا دشوار کام ہے۔ بلکہ ایسے مواقع میں عموماً دنیوی اثر و رسوخ زیادہ کارگر سمجھے جاتے ہیں۔ لہٰذا وہاں پر لزوم دیت کی جو صورتیں بیان کی گئی ہیں ان پر عمل پیرا ہونا پڑے گا۔ یہ اسی صورت میں ہے جبکہ فریقین شرعی فیصلہ کے خواہاں ہوں۔ آج کل ایسے معاملات اور حادثات وغیرہ کی صورت میں ٹریفک کے قواعد و ضوابط کے پیش نظر حکومت کی جانب سے قانون نافذ کرنے والے ادارے اپنے قانون کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں، ایسے فیصلے شریعت محمدیہ سے میل نہیں کھاتے۔

ضروری توضیح

شریعتِ محمدیہ کی رو سے اصل جنس شے کی عدم دستیابی کی صورت میں اس کی قیمت کی ادائیگی معتبر سمجھی جاتی ہے لہٰذا صورتِ ہذا میں مذکور اونٹوں کی دیت میں اگر اونٹ میسر نہ ہوں تو اونٹوں کی مروجہ علاقائی قیمت کی ادائیگی لازم ہوگی۔ اسی طرح اگر دونوں متصادم گاڑیوں میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد ہر ایک گاڑی میں ایک سے زیادہ ہو۔ زائد افراد خواہ ایک گھرانے کے ہوں یا مختلف گھرانوں کے سب کا حکم وہی ہے جو مذکور ہوا۔ یہ اسی وجہ سے ہے کہ شریعتِ محمدیہ کے مطابق اگر ایک شخص نے پورے ایک گروہ کو قتل کر ڈالا ہو تو قصاص لینے کی صورت میں ہلاک شدہ گروہ کے عوض میں اُسی ایک قاتل کو قتل کیا جائے گا۔ دیت لینے کی صورت میں قاتل شخص کی طرف سے مقتول گروہ والوں کو ایک ہی دیت ملے گی۔ اسی صورت میں سو اونٹ قاتل والوں سے لے کر مقتول گروہ والوں میں برابر برابر بانٹ دیئے جائیں گے۔

اگر بہت سے افراد پر مشتمل ایک گروہ نے مل کر ایک ہی شخص کو قتل کر ڈالا ہو تو ایک ہی مقتول کے عوض میں قصاص لینے کی صورت میں پورے قاتل گروہ کو قتل کیا جائے گا اور دیت لینے کی صورت میں مقتول شخص کے وارثوں کو قاتل گروہ والوں سے ایک ہی دیت ملے گی۔ دیت کو قاتل گروہ میں شامل افراد میں برابر بانٹ دی جائے گی۔ مثلاً قاتل گروہ دس افراد پر مشتمل ہو تو سو اونٹوں کو ان میں برابر برابر بانٹ دینے کی صورت میں ہر ایک کا حصہ دس دس اونٹ ٹھہرے گا۔ لہٰذا قاتل گروہ میں شامل ہر ہر فرد قاتل کی طرف سے دس دس اونٹ لے کر مقتول کے وارثوں کے حوالے کر دیئے جائیں گے۔

سوار اور پیدل کا تصادم

اگر کسی گاڑی کا کسی پیدل چلنے والے سے تصادم ہو جائے اور گاڑی کی ٹکر سے پیدل شخص ہلاک ہو جائے تو یہاں بھی ہلاک ہونے والے کے وارث لوگوں کو گاڑی والے سے آدھی دیت ملے گی۔ یعنی ہلاک شدہ مرد ہونے کی صورت میں پچاس اونٹ اور ہلاک شدہ عورت ہونے کی صورت میں پچیس اونٹ بطور دیت ملیں گے۔

ایک دوسرے کو معاف کرنا عام حالات کی طرح ٹریفک کے حادثات کی صورت میں بھی از روئے شریعت محمدیہ درست ہے۔ اس صورت میں ہر ایک بری ہو جائے گا۔

قارئین کرام
سے گذارش ہے کہ وہ اپنی نگارشات صفحہ کے ایک طرف صاف، واضح اور خوشخط تحریر فرمائیں۔
ادارہ

گذارش

زیرِ نظر "نوائے صوفیہ" کا ابتدائی شمارہ ھے لہٰذا اس میں کتابت یا کسی قسم کی غلطی کیلئے ھم قارئین کی طرف سے رھنمائی کا خیر مقدم کریں گے۔

خریداری کا کوپن

جو حضرات "نوائے صوفیہ" کے مستقل خریدار بننا چاہیں وہ اس کوپن کو پُر کر کے درج ذیل پتہ پر ارسال کریں تاکہ رسالہ بذریعہ ڈاک آپ تک پہنچ سکے۔

دفتر: **نوائے صوفیہ**

جامع مسجد صوفیہ نوربخشیہ G — 7/4 اسلام آباد

نام ________________

خط و کتابت کا پتہ ________________

____

قارئین توجہ فرمائیں

جملہ قارئین کو مطلع کیا جاتا ہے کہ رسالۃ ھذا میں جو فقہی مسائل مندرج ہے وہ ملت نوربخشیہ کے پیر طریقت سمیت تمام علمائے کرام کا متفقہ مسئلہ نہیں ہے لہذا انجمن فلاح و بہبود نے ماضی کی تلخیات اور مستقبل کے مختلف خدشات کو بھانپتے ہوئے فیصلہ کرلیا ہے کہ پاک مسلک کے اندر تمام اختلاقی و غیر اختلافی مسائل سمیت عقائید وفقہ کے مسائل پیر نوربخشیہ صاحب کی اجازت سے ہی شائع کردیئے جائیں۔

تمام اختلافی مسائل فقہ اور عقائید کے متعلق تمام تشریات جب پر پیر طریقت صاحب کی اجازت نہ ہو وہ قابل قبول نہیں ہوگا یہ فیصلہ انجمن فلاح و بہبود نے ہماری مرکزئیت اور وحدانیت کے پیش نظر اور ہمارے عقائید کے مطابق پیر نوربخشیہ صاحب کی اجازت کو ضروری سمجھتے ہوئے کیا ہے لہذا گزارش ہے کہ جملہ قارئین رسالہ ھذا کو پڑھنے کے بعد رائیٹر کو پیر صاحب کی اجازت کے بغیر دوبارہ ضبط قلم لانے سے گریز کرنے کے لئے کہیں۔

فقط انجمن فلاح وبہبود نوربخشیہ (رجسٹرڈ) کراچی.